

تباہ اور بگاڑ

(یہ تقریر ۱۰ مئی ۱۹۷۷ء کو دارالاسلام ٹھکانوٹ کے جلسہ عام میں کی گئی تھی۔ سامعین میں دو ہزار مسلمانوں کے علاوہ ڈیڑھ دو سو ہندو اور سکھ اصحاب بھی شریک تھے۔ پس منظر میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب سائبر مشرقی پنجاب ایک کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹنے کے لئے تیار تھا اور میں ہی مہینے بعد وہاں فتنہ و فساد کی وہ آگ بھڑکنے والی تھی جس کی تباہ کاریاں اب تاریخ انسانی کا ایک دردناک ترین باب بن چکی ہیں)

تعریف اور شکر اس خدا کے لئے ہے جس نے ہمیں پیدا کیا، عقل اور سمجھ بوجھ عطا کی، برے اور بھلے کی تمیز بخشی، اور ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنے بہترین بندوں کو بھیجا۔ اور سلام ہو خدا کے ان نیک بندوں پر جنہوں نے آدم کی اولاد کو آدمیت کی تعلیم دی، بھلے مانسوں کی طرح رہنا سکھایا، انسانی زندگی کے اصل مقصد سے انہیں ناگاہ کیا اور وہ اصول ان کو بتائے جن پر چل کر وہ دنیا میں سکھ اور آخرت میں نجات پاسکتے ہیں۔

حاضرین و حضرات! یہ دنیا جس خدا نے بنائی ہے اور جس نے اس زمین کا فرش بچھا کر اس پر انسانوں کو بسایا ہے وہ کوئی اندھا دھند اور اہل ٹپ کام کرنے والا خدا نہیں ہے۔ وہ چوپٹ راجہ نہیں ہے کہ اس کی گھڑی اندھیرنگری ہو۔ وہ اپنے مستقل قانون، پختہ ضابطے اور مضبوط قاعدے رکھتا ہے جن کے مطابق وہ اس سارے جہان پر خدائی کر رہا ہے۔ اس کے قانون سے جس طرح سورج، چاند، زمین اور تارے بندھے ہوئے ہیں جس طرح ہوا پانی، درخت اور جانور بندھے ہوئے ہیں، اسی طرح ہم آپ سب انسان بھی بندھے ہوئے ہیں۔ اس کا قانون جس طرح ہماری پیدائش اور موت پر، ہمارے بچپن اور جوانی اور بڑھاپے پر، ہمارے سانس کی آمد و رفت پر، ہمارے ہاضمے اور خون کی گردش پر اور ہماری بیماری اور تندرستی پر بے لاگ اور اہل طریقے

سے چل رہا ہے، ٹھیک اسی طرح اس کا ایک اور قانون بھی ہے جو ہماری ناپختگی کے آثار چھٹھا و پراہم سے گزرنے اور اٹھنے پر ہماری ترقی اور ترقی پر، اور ہماری ذاتی، قومی اور ملکی تقدیروں پر حکومت کر رہا ہے اور یہ قانون بھی اتنا ہی بے لاک اور اٹل ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی ناک سے سانس لینے کے بجائے آنکھوں سے سانس لینے لگے اور معدے میں کھانا مضغ کرنے کے بجائے دل میں مضغ کرنے لگے، تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے جس راہ پر چل کر کسی قوم کو نیچے جانا چاہیے وہ اسے پسند ہی لے جائے۔ اگر آگ ایک کے لئے گرم اور دوسرے کے لئے ٹھنڈی نہیں ہے تو برے کر تو ت بھی جو خدا کے قانون کی رو سے برے ہیں، ایک کو گرانے والے اور دوسرے کو اٹھانے والے نہیں ہو سکتے۔ جو اصول بھی خدا نے انسان کی بھلی اور بُری تقدیر بنانے کے لئے مقرر کئے ہیں وہ نہ کسی کے بدلے بدل سکتے ہیں، نہ کسی کے ٹالے ٹل سکتے ہیں، اور نہ ان میں کسی کے ساتھ دشمنی اور کسی دوسرے کے ساتھ رعایت ہی پائی جاتی ہے۔

خدا کے اس قانون کی ہمیشہ جی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ

وہ بناؤ کو لپ نہ کرنا ہے اور بگاڑ کو لپ نہ نہیں کرتا

ناک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے، اس کو زیادہ سے زیادہ سناور جائے۔ اس کے دے ہوئے فرائض اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے استعمال کیا جائے۔ وہ اس بات کو مرگہ لپ نہ نہیں کرتا۔ اور اس سے یہ توقع کی بھی نہیں جاسکتی کہ وہ کبھی اسے پسند کریگا۔ کہ اس کی دنیا بگاڑ دی جائے، اچاڑی جائے اور اس کو بد نظمی سے آگندگیوں سے اور ظلم و ستم سے خراب کر دیا جائے۔ انہی چیزیں ہیں جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار ہیں مگر غصہ ہوئے ہیں، ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظر انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ انہی کو وہ یہاں انتظام کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔ پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا۔ جب تک ان کا بناؤ ان کے بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا امیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور ان سے کم بگاڑنے والا امیدوار میں موجود نہیں ہوتا

اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے تمام مسرووں کے باوجود دنیا کا انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے۔ مگر جب وہ کم ہنگام اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں تو خدا انہیں بن کر بیک دیتا ہے اور دوسرے اُمیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔

یہ قانون بالکل ایک فطری قانون ہے اور آپ کی عقل بھی دیکھی کہ اس کو ایسا ہی بنانا چاہیے۔ اگر آپ میں کسی شخص کا کوئی باغ ہو اور وہ اسے ایک مالی کے سپرد کرے تو آپ خود بتائیے کہ وہ اس مالی سے کیا بات کیا چاہے گا؟ باغ کا مالک اپنے مالی سے اس کے سوا آخر اور کیا چاہ سکتا ہے کہ وہ اس کے باغ کو بنائے نہ کہ خراب کر کے رکھ دے۔ وہ تو ناگزیر ایسی چاہے گا کہ اس کے باغ کو زیادہ سے زیادہ بہتر حالت میں رکھا جائے، زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے، اس کے حسن میں اس کی صفائی میں، اس کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ جس مالی کو وہ دیکھے گا کہ وہ خوب محنت سے، جی ٹکا کر، سیلے اور قابلیت کے ساتھ اس کے باغ کی خدمت کر رہا ہے، اس کی ریشوں کو سنوار رہا ہے، اس کے اچھے درختوں کو پرورش کر رہا ہے، اس کو بُری ذات کے درختوں اور جھاڑ جھنڈ کاٹ رہا ہے، اور اس میں اپنی جدت اور جدت سے عمدہ پھولوں اور پھولوں کی نئی نئی قسموں کا اضافہ کر رہا ہے تو ضرور ہے کہ وہ اس سے خوش ہو، اسے ترقی دے اور ایسے لائق مندرجہ شناس اور خدمت گزار مالی کو نکالنا کبھی پسند نہ کرے۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ دیکھے کہ مالی نا لائق بھی ہے کام چوری ہے اور جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھ اس باغ کے ساتھ بدخواہی بھی کر رہا ہے، سارا باغ گندگیوں سے اٹا پٹا ہے، ریشوں ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں، پانی نہیں بلا ضرورت بہ رہا ہے، درختیں قلعے کے قلعے سوکھتے چلے جا رہے ہیں، گھاس پھوس اور جھاڑ جھنڈ کاٹتے چلے جاتے ہیں اور پھولوں اور پھولدار درختوں کو بے دردی کے ساتھ کاٹ کاٹ کر اور توڑ توڑ کر پھینک جا رہا ہے، اچھے درخت خرچ جا رہے ہیں اور خامداج بھاڑیاں بڑھ رہی ہیں، تو آپ خود ہی سوچئے کہ باغ کا مالک ایسے مالی کو کیسے پسند کر سکتا ہے۔ کون سی سفارش، کوئی عرض معروض اور دست بستہ التجا میں، اور کہنے آباہی حقوق یا دوسرے خود ساختہ حقوق کا لحاظ اس کو اپنا باغ ایسے مالی کے حوالے کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ رعایت وہ پس اتنی ہی تو کرے گا کہ جسے تنبیہ کر کے پھر ایک دفعہ دیدے۔ مگر جو مالی تنبیہ پر بھی ہوش میں نہ آئے اور باغ کو اچھا لے ہی چلا جائے اس کا سلاج

اس کے سوا اور کیا ہے کہ باغ کا مالک کان پکڑ کر اسے نکال باہر کرے اور دوسرا مالی اس کی جگہ رکھے۔
 اب غور کیجئے کہ اپنے ایک ذرا سے باغ کے انتظام میں جب آپ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو خدا جس نے
 اپنی اتنی بڑی زمین اتنے سرو سامان کے ساتھ انسانوں کے حوالہ کی ہے اور اتنے وسیع اختیارات ان کو
 اپنی دنیا اور اس کی چیزوں پر دئے ہیں، وہ آخر اس سوال کو نظر انداز کیسے کر سکتا ہے کہ آپ اس کی دنیا بنا
 رہے ہیں یا اجاڑ رہے ہیں۔ آپ بنا رہے ہوں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ آپ کو خواہ مخواہ ہٹا دے۔
 لیکن اگر آپ بنائیں کچھ نہیں اور اس کے اس عظیم الشان باغ کو بگاڑتے اور اجاڑتے ہی چلے جائیں، تو اپنے
 اپنے دعوے اپنی دانست میں خواہ کسی ہی زبردست من مانی بنیادوں پر قائم کر رکھے ہوں، وہ اپنے باغ پر
 آپ کے کسی حق کو تسلیم نہیں کریگا اور کچھ شبہات کر کے، سنبھلنے کے دو چار مواقع دیکر آخر آپ کو انتظام سے
 بے دخل ہی کر کے چھوڑے گا۔

اس معاملہ میں خدا کا نقطہ نظر انسانوں کے نقطہ نظر سے، طبعی طرح مختلف ہے جس طرح خود انسانوں
 میں ایک باغ کے مالک کا نقطہ نظر اس کے مالی کے نقطہ نظر سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ مالیوں کا
 ایک خاندان دو چار پشت سے ایک شخص کے باغ میں کام کرتا چلا آ رہا ہے۔ ان کا کوئی دادا پردادا اپنی لیاقت و
 قابلیت کی وجہ سے یہاں رکھا گیا تھا۔ پھر اس کی اولاد نے بھی کام اپنا کیا، تو مالک نے سوچا کہ خواہ مخواہ
 انہیں ہٹانے اور نئے آدمی رکھنے کی کیا ضرورت ہے، جب کام یہ بھی اچھا ہی کر رہے ہیں تو ان کا حق و سزا
 سے زیادہ ہے۔ اس طرح یہ خاندان باغ میں جم گیا۔ لیکن اب اس خاندان کے لوگ نہایت مالائق، بے سلیقہ،
 کام چورا و زافرض شناس اٹھے ہیں۔ باغبانی کی کوئی نہ لاشیت ان کے اندر نہیں ہے۔ سارے باغ کا ستبان اس
 کئے ڈالتے ہیں۔ اور اس پر ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم باپ دادا کے وقتوں سے اس باغ میں رہتے چلے آتے
 ہیں، ہمارے پردادا ہی کے ہاتھوں اول اول یہ باغ آباد ہوا تھا، لہذا ہمارے اس پر پیدائشی حقوق ہیں، اور
 اب کسی طرح یہ جائز نہیں ہے کہ ہمیں بے دخل کر کے کسی دوسرے کو یہاں کا مالی بنادیا جائے۔ یہ ان مالائق
 مالیوں کا نقطہ نظر ہے۔ مگر کیا باغ کے مالک کا نقطہ نظر بھی یہی ہو سکتا ہے؟ کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ میرے
 نزدیک تو سب سے مقدم چیز میرے باغ کا حسن انتظام ہے۔ میں نے یہ باغ تمہارے پردادا کے لئے

نہیں لگایا تھا جسے تمہارے پرداد کو اس باغ کے لئے نوکر رکھا تھا۔ تمہارے اس پرچہ حقوق بھی ہیں خدمت اور قابلیت کے ساتھ شروط ہیں۔ باغ کو بناؤ گے تو تمہارے سب حقوق کا لحاظ کیا جائیگا۔ اپنے پرانے مالیوں سے آخر مجھے کیا دشمنی ہو سکتی ہے کہ وہ کام اچھا کریں تب بھی میں انہیں خواہ مخواہ نکال ہی دوں اور نئے امیڈ والوں کا بلا ضرورت تجربہ کروں۔ لیکن اگر اس باغ ہی کو تم بگاڑتے اور اجاڑتے رہے جس کے انتظام کی خاطر تمہیں رکھا گیا تھا تو پھر تمہارا کوئی حق مجھے تسلیم نہیں ہے، دوسرے امیڈ وار موجود ہیں، باغ کا انتظام ان کے حوالے کر دینگا اور تم کو ان کے ماتحت پیش خدمت بن کر رہنا ہوگا۔ اس پر بھی اگر تم درست نہ ہوئے اور ثابت ہوا کہ ماتحت کی حیثیت سے بھی تم کسی کام کے نہیں ہو، بلکہ کچھ بگاڑنے ہی والے ہو، تو تمہیں یہاں سے نکال یا ہر کیا جائیگا اور تمہاری جگہ خدمت گار بھی دوسرے ہی لاکر بسائے جائیں گے۔

یہ فرق جو مالک اور مالیوں کے نقطہ نظر میں ہے، ٹھیک یہی فرق دنیا کے مالک اور دنیا والوں کے نقطہ نظر میں بھی ہے۔ دنیا کی مختلف قومیں زمین کے جس جس خط میں بستی ہیں، ان کا دعویٰ یہی ہے کہ یہ خطہ ہمارا قومی وطن ہے، پشتہا پشت سے ہم اور ہمارے باپ دادا یہاں رہتے چلے آ رہے ہیں، اس ملک پر ہمارے پیدائشی حقوق ہیں، لہذا یہاں انتظام ہمارا اپنا ہی ہونا چاہیے، کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ باہر سے آکر یہاں کا انتظام کرے۔ مگر زمین کے اصلی مالک، خدا کا نقطہ نظر یہ نہیں ہے۔ اس نے کبھی ان قومی حقوق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ نہیں مانتا کہ ہر ملک پر اس کے باشندوں کا پیدائشی حق ہے جس سے اس کو کسی حال میں بیدخل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ کوئی قوم اپنے وطن میں کام کیا کر رہی ہے۔ اگر وہ نباؤ اور سوار کے کام کرتی ہو، اگر وہ اپنی قوتیں زمین کی اصلاح و ترقی میں استعمال کرتی ہو، اگر وہ بریلو کی پیداوار روکنے اور بیدائیوں کی کھیتی سیچنے میں لگی ہوئی ہو، تو مالک کائنات کہتا ہے کہ بیشک تم اس کے مستحق ہو کہ یہاں کا انتظام تمہارے ہاتھ میں رہنے دیا جائے، تم پہلے سے یہاں آباد بھی ہو اور اہل بھی ہو، لہذا تمہارا ہی حق دوسروں کی بہ نسبت تقدم ہے۔ لیکن اگر معاملہ برعکس ہو، نباؤ کچھ نہ ہو اور سب بگاڑ ہی کے کام ہوئے جا رہے ہوں، بھلائیاں کچھ نہ ہوں اور برائیوں ہی سے خدا کی زمین بھری جا رہی ہو، جو کچھ خدا نے زمین پر پیدا کیا ہے اسے بیدردی کے ساتھ تباہ کیا جا رہا ہو اور کوئی بہتر کام اس سے لیا ہی نہ جاتا ہو، تو پھر خدا کی طرف سے

پہلے کچھ ملکی اور کچھ سخت پوئیں لگائی جاتی ہیں تاکہ یہ لوگ ہوش میں آئیں اور اپنا رویہ درست کر لیں۔ پھر جب وہ قوم اس پر بھی درست نہیں ہوتی تو اسے ملک کے انتظام سے بے دخل کر دیا جاتا ہے اور کسی دوسری قوم کو، جو کم از کم اس کی بہ نسبت اہل تر ہو، وہاں کی حکومت سونپ دی جاتی ہے۔ اور بات اس پر بھی ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر تحت بننے کے بعد بھی باشندگان ملک کسی لیاقت و اہلیت کا ثبوت نہیں دیتے اور اپنے عمل سے یہی نظام بر کرتے ہیں کہ ان سے کچھ بھی بن نہ آئیگا بلکہ کچھ بگڑے گا ہی تو خدا بھرا یہی قوم کو مٹا دیتا ہے اور دوسروں کو۔ بے آنا ہے جو اس کی جگہ بنتے ہیں۔ اس حالت میں خدا کا نقطہ نظر ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو مالک کا ہونا چاہیے۔ وہ اپنی زمین سے انتظام میں دعویٰ داروں اور امیدواروں کے آبائی یا پیدا شدہ حقوق نہیں دیکھتا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کون بناؤ کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور بگاڑ کی طرف کم سے کم میلان رکھتا ہے۔ ایک وقت کے امیدواروں میں سے جو اس لحاظ سے اہل تر نظر آتے ہیں، انتخاب انہی کا ہوتا ہے اور جب تک ان کے حجاز سے ان کا بناؤ زیادہ رہتا ہے، یا جب تک ان کی بہ نسبت زیادہ اچھا بنانے والا اور کم بگاڑنے والا کوئی امیدوار میں نہیں آ جاتا، اس وقت تک انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے۔

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں، تاریخ کواد ہے کہ خدا نے ہمیشہ اپنی زمین کا انتظام اسی اصول پر کیا ہے۔ وہ کیوں جاسیے، خود اپنے اسی ملک کی تاریخ دیکھ لیجئے۔ یہاں جو قومیں پہلے آباد تھیں ان کی تسمیری صلاحیتیں جب ختم ہو گئیں تو خدا نے انہیں کو یہاں کے انتظام کا موقع دیا جو اپنے وقت کی قوموں میں سب سے زیادہ اچھی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ انہوں نے یہاں آکر ایک بڑے شاندار تمدن کی بنیاد رکھی، بہت سے علوم و فنون ایجاد کئے، زمین کے ترانوں کو نکالا اور انہیں بہتری میں استعمال کیا، بگاڑ سے زیادہ بنائے کام کے دکھائے۔ یہ قاعدیتیں جب تک ان میں رہیں تاریخ کے سارے نشیموں اور فرازوں کے باوجود وہی اس ملک کے منتظم رہے۔ دوسرے بے سید دار بڑھ کر آگے آئے مگر بحکیم رہے گئے کیونکہ ان کے ہوتے دوسرے منتظم کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے حملے زیادہ سے زیادہ بس حیثیت رکھتے تھے کہ جب بھی یہ ذرا بگڑنے لگے تو کسی کو بھیج دیا گیا تاکہ انہیں متنبہ کر دے۔ مگر جب یہ بگڑتے ہی پتلے گئے اور انہوں نے نہ نفاذ کے

کام کم اور بگاڑ کے کام زیادہ کرنے شروع کرے، جب انہوں نے اخلاق میں وہ لپٹی اختیار کی جس کے آثار نام مار کی تحریک میں آب اب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جب انہوں نے انسانیت کو تقسیم کر کے خود اپنی ہی سوسائٹی کو درلوں اور ذاتوں میں پھاڑ ڈالا اور اپنی اجتماعی زندگی کو ایک زینے کی شکل میں ترتیب دیا جس کی ہر سیڑی کا بیٹھنے والا اپنے سے اوپر کی سیڑھی رانے کا بندہ اور نیچے کی سیڑھی رانے کا خدا بن گیا، جب انہوں نے خدا کے لاکھوں کروڑوں بندوں پر وہ ظلم ڈھایا جو آج تک اچھوت پن کی شکل میں موجود ہے، جب انہوں نے علم کے دروازے عام انسانوں پر بند کر دیے اور ان کے پنڈت علم کے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھ گئے، اور جب ان کے کاروبار طبقوں کے پاس اپنے زبردستی جمائے ہوئے حقوق وصول کرنے اور دوسروں کی محنتوں پر داد عیش دینے کے سوا کوئی کام نہ رہا تو خدا نے آخر کار ان سے ملک کا انتظام چھین لیا اور وسط ایشیا کی ان قوموں کو یہاں کام کرنے کا موقع یا جو اس وقت اسلام کی تحریک سے متاثر ہو کر زندگی کی بہتر سلامتیوں سے آراستہ ہو گئی تھیں۔

یہ لوگ سینکڑوں برس تک یہاں کے انتظام پر سرفراز رہے۔ اور ان کے ساتھ خود اس ملک کے بھی بہت سے لوگ اسلام قبول کر کے شامل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے بہت کچھ بگاڑا بھی، مگر قبضہ بگاڑ اس سے زیادہ بنایا۔ کئی سو برس تک ہندوستان میں بناؤ کا جو کام بھی ہوا انہی کے ہاتھوں ہوا یا پھر ان کے اثر سے ہوا۔ انہوں نے علم کی روشنی پھیلانی، خیالات کی اصلاح کی، تمدن و معاشرت کو بہت کچھ درست کیا، ملک کے ذرائع و وسائل کو اپنے عہد کے معیار کے لحاظ سے بہتری میں منتقل کیا، اور اس و انصاف کا عمدہ نظام قائم کیا جو اگرچہ سلام کے اصلی معیار سے بہت کم تھا مگر پہلے کی حالت اور گرد و پیش کے دوسرے ملکوں کی حالت سے مقابلہ کرتے ہوئے کافی بلند تھا۔ اس کے بعد وہ بھی اپنے ہمیشہ ردوں کی طرح بگڑنے لگے۔ ان کے اندر بھی بناؤ کی صلاحیتیں گھٹنی شروع ہوئیں اور بگاڑ کے میلانات بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے بھی اونچ نیچ اور نسلی امتیازات اور طبقاتی تفریقیں کر کے خود اپنی سوسائٹی کو پھاڑ دیا جس کے بے شمار اخلاقی، سیاسی اور تمدنی نقصانات ہوئے انہوں نے بھی انصاف کم اور ظلم زیادہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی حکومت کی ذمہ داریوں کو بھول کر صرف اس کے فائدوں

اور زیادہ تر ناجائز آمدوں پر نظر کھٹے لگے۔ انہوں نے بھی تعمیر، ترقی اور اصلاح کے کام چھوڑ کر خدا کی دی ہوئی قوتوں اور ذرائع کو ضائع کرنا شروع کیا اور اگر استعمال کیا بھی تو زیادہ تر زندگی کو بگاڑنے والے کاموں میں کیہ تن آسانی و عیش پرستی میں وہ اتنے کھوئے گئے کہ جب آخری شکست کھا کر ان کے فزوں رواؤں کو دلی کے لال قلعہ سے نکلنا پڑا تو ان کے شاہزادے — وہی جو ملک کی حکومت کے امیر وارتھے — جان بچانے کے لئے بھاگ بھی نہ سکتے تھے کیونکہ زمین پر چلنا انہوں نے پیوڑ رکھا تھا۔ مسلمانوں کی عام اخلاقی پستی اور حد کو پہنچ گئی کہ ان کے عوام سے بیکر برسے بڑے ذمہ دار لوگوں تک کسی میں بھی اپنی ذات کے سوا دوسری کسی چیز کی وفاداری باقی نہ رہی جو انہیں دین، فردشی، قوم، فردشی اور ملک فردشی سے رکتی۔ ان میں ہزاروں لاکھوں پیشہ ورسپاہی پیدا ہونے لگے جن کی اخلاقی حالت پاتوکتوں کی سی تھی کہ جو چاہے روٹی دیکر انہیں پالے اور پھر جس کا دل چاہے ان سے شکار کرالے۔ ان میں یہ احساس بھی باقی نہ رہا تھا کہ یہ ذلیل ترین پیشہ، جس کی بدولت ان کے دشمن خود انہی کے ہاتھوں ان کا ملک فتح کر رہے تھے، اپنے اند کوئی ذلت کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ غالب جب شخہ فخریہ کہتا ہے کہ ”سو شیت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری“ یہ بات کہتے ہوئے ہمارے لئے بڑے شاعر کو ذرا خیال تک نہ نررا کہ پیشہ ورا نہ سپہ گری کوئی خیر کی نہیں، بدوب مرنے کی بات ہے۔

جب یہ ان کی حال — ہو گئی تو خدا نے ان کی معذرتی کا بھی فیصلہ کر لیا اور ہندوستان کے انتظام کا غیب پھرنے امیدواروں کے لئے کھل گیا اس برقع پر چاہے امیدوار میدان میں تھے مرہٹے، سکھ، انگریز اور بعض مسلمان رئیس۔ آپ خود انصاف کے ساتھ قومی نصب کی عینک اتار کر اس دور کی تاریخ اور بعد کے حالات کو دیکھینگے تو آپ کا دل گواہی دیگا کہ دوسرے امیدواروں میں سے کسی میں بھی بناؤ کی وہ صلاحیتیں نہ تھیں جو انگریزوں میں تھیں، اور بت بگاڑ انگریزوں میں تھا اس سے کہیں زیادہ بگاڑ مرہٹوں، سکھوں اور مسلمان امیدواروں میں تھا جو کچھ انہوں نے بنایا وہ ان میں سے کوئی نہ بناتا۔ اور جو کچھ انہوں نے بگاڑا اس سے بہت زیادہ یہ امیدوار بگاڑ کر رکھ دیتے، مطلقاً دیکھئے تو انگریزوں میں بہت سے پہلو تھے جن سے ہندوستانیوں کی برائیاں آپ کو نظر آئیں گی مرقابا بتا دیکھئے تو اپنے ہم عصر رئیسوں سے ان کی برائیاں بہت کم اور ان کی خوبیاں بہت زیادہ نکلیں گی یہی وجہ ہے کہ ان کے قانون نے پھر ایک مرتبہ انسانوں کے اس میں منہ اٹھانے کی توڑ دیا جانہوں نے پھر بھی

حق کے بنا رکھا ہے کہ ہر ملک خود ملکوں کے لئے ہے خواہ وہ اسے بنائیں یا بگاڑیں۔ اس نے تاریخ کے اٹل فیصلے ثابت کیے کہ نہیں، ملک تو خدا کا ہے، وہی یہ طے کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس کا انتظام اس سے سپرد کرے اور اس کا فیصلہ کسی نسلی، قومی یا آبائی حق کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ مجموعی بھلائی کون سے انتظام میں ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکُ الْمَلٰٓئِکِ تُوٰتِی الْمُلُکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلُکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بَیْدُکَ الْغَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

اس طرح اللہ تعالیٰ ہزاروں میل کے فاصلہ سے ایک ایسی قوم کو لے آیا جو کبھی یہاں تین چار لاکھ کی تعداد سے زیادہ نہیں رہی اور اس نے یہیں کے ذرائع اور یہیں کے آدمیوں سے یہاں کی ہندو، سلم، سکھ سب قوتوں کو زیر کر کے اس ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہاں کے کروڑوں باشندے ان مٹی بھرا انگریزوں کے تابع فرمان بن کر رہے۔ ایک ایک انگریز نے تنہا ایک ایک ضلع پر حکومت کی۔ بغیر اس کے کہ اس کی قوم کا کوئی دوسرا فرد اس کا ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اس کے پاس موجود ہوتا۔ اس تمام دوران میں ہندوستانیوں نے جو کچھ پیش خدمت کی حیثیت سے کیا نہ کہ کارفرما کی حیثیت سے۔ ہم سب کو یہ ماننا پڑ گیا، اور نہ مانیں گے تو حقیقت کو جھٹلائیں گے، کہ اس ساری مدت میں جبکہ انگریز یہاں رہے، بناؤ کا جو کچھ بھی کام ہوا انگریزوں کے ہاتھوں سے اور ان کے اثر سے ہوا جس حالت میں انہوں نے ہندوستان کو پایا تھا اس کے مقابلہ میں آج کی حالت دیکھئے تو آپ اس بات سے انکار نہ کر سکیں گے کہ بگاڑ کے باوجود بناؤ کا بہت سا کام ہوا جس کے خدا اہل ملک کے ہاتھوں انجام پانے کی ہرگز توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ اس لئے تقدیر الہی کا وہ فیصلہ غلط نہ تھا جو اس نے اٹھارویں صدی کے وسط میں کر دیا تھا۔

اب دیکھئے کہ جو کچھ انگریز بنا سکتے تھے وہ بنا چکے ہیں۔ ان کے بناؤ کے حساب میں اب کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس حساب میں جو اضافہ کر سکتے ہیں وہ دوسروں کے ہاتھوں بھی ہو سکتا ہے۔ مگر دوسری طرف ان کے بگاڑ کا حساب بہت بڑھ چکا ہے اور جتنی مدت بھی وہ یہاں رہیں گے بناؤ کی بہ نسبت بگاڑ ہی

۱۵۔ کہو کہ خدایا، ملک کے ملک! تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت، دتیلے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

زیادہ بڑھائیں گے۔۔۔ ان کی فردِ جرح اتنی لمبی ہے کہ اسے ایک صحبت میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اور اس کے بیان کی کوئی حاجت بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ سب کے سامنے ہے۔۔۔ اب تقدیر الہی کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ یہاں کے انتظام سے بے دخل کر دئے جائیں۔ انہوں نے بہت عقلمندی سے کام لیا کہ خود سیدھی طرح رخصت ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ سیدھی طرح نہ جاتے تو پھر بھی طرح نکالے جاتے کیونکہ خدا کے اہل قوانین اب ان کے ہاتھ میں یہاں کا انتظام دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔

یہ موقع جس کے تین سرے پر ہم آپ کھڑے ہیں، تاریخ کے اُن اہم مواقع میں سے ہے جب زیرِ کاغذ اصلی مالک کسی ملک میں ایک انتظام کو ختم کرتا ہے اور دوسرے انتظام کا فیصلہ کرتا ہے۔ بنیاد پر جس طرح یہاں انتقال اختیارات کا معاملہ طے ہوتا نظر آ رہا ہے اس سے یہ دھوکا نہ کھاجیے کہ قطعی فیصلہ ہے جو ملک کا انتظام خود اہل ملک کے حوالے کئے جانے کے حق میں ہو رہا ہے۔ آپ شاید معاملہ کی سادہ سی سمجھت یہ سمجھتے ہوں گے کہ جنہی لوگ جو باہر سے آکر حکومت کر رہے تھے واپس جا رہے ہیں اس لئے اب یہ آپ سے آپ ہو نا ہی چاہیے کہ ملک کا انتظام خود ملکوں کے ہاتھ آئے نہیں، خدا کے فیصلے اس طرح کے نہیں ہوتے وہ ان اجنبیوں کو نہ پہلے بلا وجہ لایا تھا نہ اب بلا وجہ لے جا رہا ہے۔ نہ پہلے اہل ٹپ اس نے آپ سے انتظام چھینا تھا اور نہ اب اہل ٹپ وہ بسے آپ کے حوالہ کر دیگا۔ اصل اس وقت ہندوستان کے باشندے، سیدوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب امیدوار ہیں۔ چونکہ یہ پہلے سے یہاں آباد چلے آ رہے ہیں اس لئے پہلا موقع انہی کو دیا جا رہا ہے۔ لیکن سیتھل تقریر نہیں ہے بلکہ محض امتحانی موقع ہے۔ اگر فی الواقع انہوں نے ثابت کیا کہ ان کے اندر گجاڑ سے بڑھ کر بناؤ کی صلاحیتیں ہیں تب تو ان کا تقریر سیتھل ہو جائیگا۔ ورنہ اپنے بناؤ سے بڑھ کر اپنا گجاڑ پیش کر کے یہ بہت جلدی دیکھ لیں گے کہ انہیں پھر اس ملک کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائیگا اور دور و نزدیک کی قوموں میں سے کسی ایک کو اس خدمت کے لئے منتخب کر لیا جائیگا۔ پھر اس فیصلے کے خلاف یہ کوئی فریاد نہ کر سکیں گے۔ دنیا بھر کے سامنے اپنی مالالہقی کا کھلا ثبوت دے چکنے کے بعد ان کا منہ کیا ہوگا کہ کوئی فریاد کریں اور ڈھیٹ بن کر فریاد کریں گے بھی تو اس کی داد کون دیگا۔

اب ذرا آپ جائزہ لیکر دیکھیں کہ ہندوستان کے لوگ، ہندو، مسلمان، سکھ، اس امتحان کے

موقع سپا پنے خدا کے سامنے اپنی کیا صلاحیتیں اور قابلیتیں اور اپنے کیا اوصاف اور کارنامے پیش کیے ہیں جن کی بنا پر یہ اُمید کر سکتے ہوں کہ خدا اپنے ملک کا انتظام پھر ان کے سپرد کر دیگا۔ اس موقع پر اگر میں بے لاگ طریقے سے کھلم کھلا وہ فرد جرم سنا دوں جو اخلاق کی عدالت میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں، سب پر لگتی ہے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ جڑ نہ مائیں گے۔ اپنی قوم اور اپنے وطنی بھائیوں کے عیوب بیان کر کے خوشی تو مجھے بھی نہیں ہوتی حقیقت میں میرا دل روتا ہے، کیونکہ میں گویا اپنی آنکھوں سے اُس انجام کو دیکھ رہا ہوں جو ان عیوب کی بنا پر کل انہیں دیکھنا ہی نہیں، بھگتنا بھی پڑیگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ عیوب انہیں لے ڈم میں گے۔ ہم، آپ، کوئی بھی ان کے انجام بد سے نہ بچے گا۔ اس لئے میں انہیں دلی سرج کے ساتھ بیان کرتا ہوں تاکہ جن کے کان ہوں وہ سنیں اور اصلاح کی کچھ فکر کریں۔

ہمارے افراد کی عام اخلاقی حالت جیسی کچھ ہے، آپ اس کا اندازہ خود اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر کیجئے۔ ہم میں کتنے فیصدی آدمی ایسے پائے جاتے ہیں جو کسی کا حق تلف کرنے میں، کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے میں، کوئی ”مفید“ جھوٹ بولنے اور کوئی ”نفع بخش“ بے ایمانی کرنے میں صرف اس بنا پر تامل کرتے ہوں کہ ایسا کرنا اخلاقاً برا ہے؟ جہاں قانون گرفت نہ کرنا ہو، یا جہاں قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی اُمید ہو وہاں کتنے فی صدی انخاص محض اپنے اخلاقی احساس کی بنا پر کسی جرم اور کسی برائی کا ارتکاب کرنے سے باز رہ جاتے ہیں؟ جہاں اپنے کسی ذاتی فائدے کی توقع نہ ہو وہاں کتنے آدمی دوسروں کے ساتھ بھلائی، ہمدردی، ایثار، حق رسانی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں؟ ہمارے تجارت پیشہ لوگوں میں ایسے تاجروں کا اوسط کیا ہے جو دھوکے اور فریب اور جھوٹ اور ناجائز نفع اندوزی سے پرہیز کرتے ہوں؟ ہمارے صنعت پیشہ لوگوں میں ایسے افراد کا تناسب کیا ہے جو اپنے فائدے کے ساتھ کچھ اپنے خریداروں کے مفاد اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی مصلحت کا بھی خیال رکھتے ہوں؟ ہمارے زمینداروں میں کتنے ہیں جو غلہ روکتے ہوئے اور بے حد گرائی قیمتوں پر بیچتے ہوئے یہ سوچتے ہوں کہ اپنی اس نفع اندوزی سے وہ کتنے لاکھ بلکہ کتنے کروڑ انسانوں کو فاقہ کشی کا عذاب دے رہے ہیں؟ ہمارے مالداروں میں کتنے ہیں جن کی دکانوں میں کٹھن ستم، کسی حق تلفی اور کسی بددیانتی کا دخل نہیں ہے؟ ہمارے محنت پیشہ لوگوں میں کتنے ہیں جو

فرض شناسی کے ساتھ اپنی اُجرت اور اپنی تنخواہ کا حق ادا کرتے ہیں؟ ہمارے سرکاری ملازموں میں کتنے ہیں جو ثبوت اور خیانت سے، ظلم اور مردم آزاری سے، کام چوری اور حرام خوری سے، اور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے بچے ہوئے ہیں؟ ہمارے وکیلوں میں، ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں میں، ہمارے اخبار نویسوں میں، ہمارے ناشرین و مصنفین میں، اور ہمارے قومی ”خدمت گزاروں“ میں کتنے ہیں جو اپنے فائدے کی خاطر ناپاک سے ناپاک طریقے اختیار کرنے اور خلق خدا کو ذہنی، اخلاقی، مالی اور جسمانی نقصان پہنچانے میں کچھ بھی شرم محسوس کرتے ہوں؟ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ کہوں کہ ہماری آبادی میں مشکل ۵ فیصدی لوگ اس اخلاقی جذام سے بچے رہ گئے ہیں، ورنہ ۹۵ فیصدی کو یہ چھوٹ بڑی طرح لگ چکی ہے۔ اس معاملہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور برہمن کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔ سب کے سب یکساں بیمار ہیں۔ سب کی اخلاقی حالت انتہائی خوفناک حد تک گری ہوئی ہے۔ اور کسی گروہ کا حال دوسرے سے بہتر نہیں ہے۔

اخلاقی تنزل کی یہ وجہ باجوب افراد کی ایک بہت بڑی اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تو قدرتی بات تھی کہ وسیع پیمانے پر اجتماعی شکل میں اس کا ظہور شروع ہو جائے۔ اس آنے والے طوفان کی پہلی علامت ہمیں اس وقت نظر آئی جب جنگ کی وجہ سے ریلوں میں مسافروں کا ہجوم ہونے لگا۔ ہاں ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جس خود غرضی، بیداری اور سنگدلی کا سلوک کیا وہ پتہ دے رہا تھا کہ ہمارے عام اخلاق کس تیز رفتاری کے ساتھ گر رہے ہیں۔ پھر شیار کی کمیابی و گرانی کے ساتھ ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہوئی۔ پھر بنگال کا وہ ہولناک مصنوعی قحط رونما ہوا جس میں ہمارے ایک طبقہ نے اپنے ہی ملک کے لاکھوں انسانوں کو اپنے نفع کی خاطر بھوک سے تڑپا تڑپا کر مار دیا۔ یہ سب ابتدائی علامات تھیں۔ اس کے بعد خیانت، کمینہ پن، درندگی اور وحشت کا وہ لاوا یکا یک پھٹ پڑا جو ہمارے اندر مدقوں سے پک رہا تھا۔ اور اب وہ فرقہ وارانہ فساد کی شکل میں ہندوستان کو ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک بھسم کر رہا ہے۔ کلکتہ کے فساد کے بعد سے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی قومی کشمکش کا

جو نیا باب شروع ہوا ہے اس میں یہ تینوں قومیں اپنی ذلیل ترین صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ جن افعال کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کوئی انسان کبھی ان کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے، آج ہماری بستیوں کے رہنے والے علانیہ ان کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے علاقوں کی پوری پوری آبادیاں غنڈہ بن گئی ہیں اور وہ کام کر رہی ہیں جو کسی غنڈے کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے۔ شیر خوار بچوں کو ماؤں کے سینوں پر رکھ کر ذبح کیا گیا ہے۔ زندہ انسانوں کو آگ میں بھونا گیا ہے۔ شریف عورتوں کو برسر عام سنگا کیا گیا ہے اور ہزاروں کے مجمع میں ان کے ساتھ بدکاری کی گئی ہے۔ باپوں، شوہروں اور بھائیوں کے سامنے ان کی بیٹیوں، بیویوں اور بہنوں کو بے عزت کیا گیا ہے۔ عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں پر غصہ نکالنے کی ناپاک ترین شکلیں اختیار کی گئی ہیں۔ بیماروں اور زخمیوں اور بوڑھوں کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ مارا گیا ہے۔ مسافروں کو چنتی ریل پر سے پھینکا گیا ہے۔ زندہ انسانوں کے اعضاء کاٹے گئے ہیں۔ ہتے اور بے بس انسانوں کا جانوروں کی طرح شکار کیا گیا ہے۔ ہمایوں نے ہمایوں کو لوٹا ہے۔ دوستوں نے دوستوں سے دغا کی ہے۔ پناہ دینے والوں نے خود اپنی دی ہوئی پناہ کو توڑا ہے۔ امن و امان کے محافظوں (پولیس اور فوج اور محبٹر یوں) نے علانیہ فساد میں حصہ لیا ہے، بلکہ خود فساد کیا اور اپنی حمایت و نگرانی میں فساد کرایا ہے۔ غرض ظلم و ستم، سنگدلی و بے رحمی اور کینہ کی و بد محاشی کی کوئی قسم ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کا ارتکاب ان چند مہینوں میں ہمارے ملک کے رہنے والوں نے اجتماعی طور پر نہ کیا ہو۔ اور ابھی دنوں کا غبار پوری طرح نکلا نہیں ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر اور بدرجہا بدتر صورت میں ابھی ہونے والا ہے۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ محض کسی اتفاقی، بے جان نتائج سے ہے؟ اگر وہ آپ کا گمان ہے تو آپ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ابھی میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس ملک کی آبادی کے ۹۵ فی صدی افراد اخلاقی حیثیت سے بیمار ہو چکے ہیں۔ جب افراد کی اتنی بڑی اکثریت بد اخلاق ہو جائے تو ان کی اجتماعی رویہ اخلاقی درست رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو، مسلمان اور سکھ تینوں

قوموں میں سچائی، انصاف اور حق پسندی کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ راست باز، دیانت دار اور شریف انسان ان کے اندر نکو بن کر رہ گئے ہیں۔ برائی سے روکنا اور بھلائی کی نصیحت کرنا ان کی سوسائٹی میں ایک ناقابل برداشت جرم ہو گیا ہے۔ حق اور انصاف کی بات سننے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قوم کو وہی لوگ پسند ہیں جو اس کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشات اور اغراض کی وکالت کریں، دوسروں کے خلاف اس کے تعصبات کو بھڑکائیں، اور اس کے جائز و ناجائز مقاصد کے لئے لڑنے کو تیار ہوں۔ اسی بنا پر ان قوموں نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے اندر سے بدترین آدمیوں کو چننا اور انہیں اپنا نمائندہ بنایا۔ انہوں نے اپنے اکابر مجرمین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور انہیں اپنا سربراہ کار بنالیا۔ ان کی سوسائٹی میں جو لوگ سب سے زیادہ پست اخلاق، بے ضمیر اور بے اصول تھے وہ ان کی ترجمانی کے لئے اٹھے اور اخبار نویسی کے میدان میں وہی سب سے بڑھ کر مقبول ہوئے۔ پھر یہ سب لوگ بگاڑ کی راہ پر اپنی بگڑی ہوئی قوموں کو سرپیٹ لے کر چلے۔ انہوں نے متضاد قومی خواہشات کو کسی نقطہ انصاف پر جمع کرنے کے بجائے اتنا بڑھایا کہ وہ آخر کار نقطہ تصاف پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے معاشی و سیاسی اغراض کی کشمکش میں غصے اور نفرت اور عداوت کا زہر ملا یا اور اسے روز بروز بڑھاتے چلے گئے۔ انہوں نے برسوں اپنی اپنی زیر اثر قوموں کو اشتعال انگیز تقریروں اور تحریروں کے انجکشن دے دے کر یہاں تک بھڑکایا کہ وہ جوش میں آکر کتوں اور بھیڑیوں کی طرح لڑنے لکھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے عوام اور خواص کے دلوں کو ناپاک جذبات کی سندھ اس اور اندھی دشمنی کا تور بنا کر رکھ دیا۔ اب جو طوفان آپ کی نگاہوں کے سامنے برپا ہے یہ کوئی دفعتی اور ہنگامی چیز نہیں ہے جو اچانک رونما ہو گئی ہو۔ یہ تو قدرتی نتیجہ ہے بگاڑ کے اُن بے شمار اسباب کا جو مدتوں سے ہمارے اندر کام کر رہے تھے، اور یہ نتیجہ بس ایک ہی دفعہ ظاہر ہو کر نہیں رہ جائیگا بلکہ جب تک وہ اسباب اپنا کام کئے جا رہے ہیں یہ روز افزوں ترقی کے ساتھ ظاہر ہوتا چلا جائیگا یہ ایک بس پھری فصل ہے جو برسوں کی تخم ریزی و آبپاری کے بعد اب پک کر تیار ہوئی ہے، اور اسے آپ کو اور آپ کی لسٹوں کو نہ معلوم کب تک کاٹنا پڑیگا۔

حضرات آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ عین اس وقت جبکہ قانون قدرت کے مطابق اس ملک کی قسمت کا نیا انتظام درپیش ہے، ہم مانگ رہے ہیں کہ سامنے اپنی اہلیت و قابلیت کا کیا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ یہ موقع تو یہ تھا کہ ہم اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کرتے کہ اگر وہ اپنی زمین کا انتظام ہمارے حوالہ کر لیتا تو ہم اسے خوب تیار بنا کر گھلزار بنا دیں گے۔ ہم اس میں انصاف کریں گے، اسے ہمدردی اور تعاون اور رحمت کا گہوارہ بنائیں گے، اس کے وسائل کو اپنی اور انسانیت کی فلاح میں استعمال کریں گے، اس میں بھلائیوں کو پروان چڑھائیں گے اور برائیوں کو دبائیں گے۔ لیکن ہم اسے بتا رہے ہیں کہ ہم ایسے غارت گر، اس قدر فساد اور اتنے ظالم ہیں کہ اگر تو نے یہ زمین ہمارے حوالہ کی تو ہم اس کی لہتیوں کو اجاڑیں گے، محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں پھونک دیں گے، انسانی جان کو مکھی اور مچھر سے زیادہ بے قیمت کر دیں گے، عورتوں کو بے عزت کریں گے، چھوٹے چھوٹے بچوں کا شکار کریں گے، بوڑھوں اور بیماروں اور زخمیوں پر بھی رحم نہ کھائیں گے، عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں تک کو اپنے نفس کی گندگی سے لیس دیں گے، اور جس زمین کو تو نے انسانوں سے آباد کیا ہے اس کی رونق ہم لاشوں اور جلی ہوئی عمارتوں سے بڑھائیں گے۔ کیا واقعی آپ کا ضمیر یہ گواہی دیتا ہے کہ اپنی یہ خدمات، یہ اوصاف، یہ کارنامے پیش کر کے آپ خدا کی نگاہ میں اس کی زمین کے انتظام کے لئے اہل ترین بندے قرار پائیں گے؟ کیا یہ کثرت دیکھ کر وہ آپ سے کہے گا کہ ”شاباش! اے میرے پرلے مالیوں کی اولاد! تم ہی سب سے بڑھ کر میرے اس باغ کی رکھوالی کے قابل ہو۔ اسی اکھیر پچھاڑ، اسی اجاڑ اور بگاڑ، اسی تباہی و بربادی اور گندگی و غلاظت کے لئے تو میں نے یہ باغ لگایا تھا، لو اب اسے اپنے ہاتھ میں لے کر خوب خراب کرو!“

میں یہ باتیں آپ سے اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ اپنے آپ سے اور اپنے ملک کے مستقبل سے مایوس ہو جائیں۔ میں نہ مایوس ہوں نہ کسی کو مایوس کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل میرا مدعا آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی حماقت اور جہالت سے اس زمین موقع کو کھونے پر تلے ہوئے ہیں جو کسی ملک کی قسمت بدلتے وقت صدیوں کے بعد خداوند عالم اس کے باشندوں کو دیا کرتا ہے۔ یہ وقت بچھا

کہ وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنے اعلیٰ اوصاف اور اپنی بہتر صلاحیتوں کا ثبوت پیش کرتے تاکہ خدا کی نگاہ میں انتظام زمین کے اہل قرار پاتے مگر آج ان کے درمیان مقابلہ اس چیز میں ہو رہا ہے کہ کون زیادہ غارت گر، زیادہ سفاک اور زیادہ ظالم ہے تاکہ سب سے بڑھ کر خدا کی لعنت کا وہی مستحق قرار پائے۔ یہ پھن آزادی اور ترقی اور سرفرازی کے نہیں ہیں۔ ان سے تو اندیشہ ہے کہ کہیں پھر ایک مدت دراز کے لئے ہمارے حق میں غلامی اور ذلت کا فیصلہ نہ لکھ دیا جائے۔ لہذا جو لوگ عقل و ہوش رکھتے ہیں، انہیں ان حالات کی اصلاح کے لئے کچھ فکر کرنی چاہیئے۔

اس مرحلہ پر آپ کے دل میں یہ سوال خود بخود پیدا ہو گا کہ اصلاح کی صورت کیا ہے؟ میں اس کا جواب دینے کے لئے حاضر ہوں۔

اس تاریکی میں ہمارے لئے اُمید کی ایک ہی شعاع ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری آبادی بگڑ کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس میں کم از کم چار پانچ فی صدی لوگ ایسے ضرور موجود ہیں جو اس عام بد اخلاقی سے بچے ہوئے ہیں۔ یہی وہ سرمایہ ہے جس کو اصلاح کی ابتدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اصلاح کی راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس صلح عنصر کو چھانٹ کر منظم کیا جائے۔ ہماری قسمتی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بدی تو منظم ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے، لیکن نیکی منظم نہیں ہے۔ نیک لوگ موجود ضرور ہیں، مگر منتشر ہیں۔ ان کے اندر کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے۔ کوئی تعاون اور اشتراک عمل نہیں ہے۔ کوئی لائحہ عمل اور کوئی مشترک آواز نہیں ہے۔ اسی چیز نے ان کو بالکل بے اثر بنا دیا ہے۔ کبھی کوئی اللہ کا بندہ اپنے گرد پیش کی برائیوں کو دیکھ کر چیخ اُٹھتا ہے، مگر جب کسی طرف سے کوئی آواز اس کی تائید میں نہیں اُٹھتی تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص حق اور انصاف کی بات علانیہ کہہ بیٹھتا ہے، مگر منظم بدی زبردستی اس کا منہ بند کر دیتی ہے اور حق پسند لوگ بس اپنی جگہ چپکے سے اس کو داد دے کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی شخص انسانیت کا خون ہونے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتا اور اس پر احتجاج کر گزرتا ہے، مگر ظالم لوگ ہجوم کر کے اسے دبا لیتے ہیں اور اس کا حشر دیکھ کر بہت سے ان لوگوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں جن کے ضمیر میں ابھی کچھ زندگی

باقی ہے۔ یہ حالت اب ختم ہونی چاہیے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک حد کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس عذاب میں نیک و بد سب گرفتار ہو جائیں، تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے اندر جو صالح عناصر اس اخلاقی دبا سے بچے رہ گئے ہیں وہ اب مجتمع اور منظم ہوں اور اجتماعی طاقت سے اس برکت سے فتنے کا مقابلہ کریں جو تیزی کے ساتھ ہمیں تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ یہ صالح عنصر اس وقت بظاہر بہت ہی مایوس کن اقلیت میں ہے۔ یہی تھوڑے سے لوگ اگر منظم ہو جائیں، اگر ان کا اپنا ذاتی اور جماعتی رویہ خالص راستی، انصاف، حق پسندی اور خلوص و دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو، اور اگر وہ مسائل زندگی کا ایک بہتر حل اور دنیا کے معاملات کو درست طریقہ پر چلانے کے لئے ایک اچھا پروگرام بھی رکھتے ہوں تو یقین جانتے کہ اس منظم نیکی کے مقابلہ میں منظم بدی اپنے لشکروں کی کثرت اور اپنے گندے ہتھیاروں کی تیزی کے باوجود شکست کھا کر رہیگی۔ انسانی فطرت شر پسند نہیں ہے۔ اسے دھوکا ضرور دیا جاسکتا ہے، اور ایک بڑی حد تک منہ بھی کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے اندر بھلائی کی قدر کا جو مادہ خالق نے ودیعت کر دیا ہے اسے بالکل معدوم نہیں کیا جاسکتا انسانوں میں ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو بدی ہی سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اس کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں۔ اور ایسے لوگ بھی کم ہوتے ہیں جنہیں نیکی سے عشق ہو اور اسے قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان عام انسان نیکی اور بدی کے ملے جلے رجحانات رکھتے ہیں۔ وہ نہ بدی کے گرویدہ ہوتے ہیں اور نہ نیکی ہی سے انہیں غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے کسی ایک طرف جھک جانے کا انحصار تمام تر اس پر ہوتا ہے کہ خیر اور شر کے علمبرداروں میں سے کون آگے بڑھ کر انہیں اپنے راستہ کی طرف کھینچتا ہے۔ اگر خیر کے علمبردار سرے سے میدان میں آئیں ہی نہیں اور ان کی طرف سے عوام الناس کو بھلائی کی راہ پر چلانے کی کوئی کوشش ہی نہ ہو، تو بالآخر میدان علمبرداران شر ہی کے ہاتھ رہے گا اور وہ عام انسانوں کو اپنی راہ پر کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر خیر کے علمبردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو عوام الناس پر علمبرداران شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کا مقابلہ آخر کار اخلاق کے میدان میں ہوگا

اور اس میدان میں نیک انسانوں کو بُرے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ بچائی کے مقابلہ میں جوڑا، ایمانداری کے مقابلہ میں بے ایمانی، اور پاکبازی کے مقابلہ میں بدکرداری خواہ کنہا ہی زور لگالے، آخری حیت بہر حال بچائی، پاکبازی اور ایمانداری ہی کی ہوگی۔ دنیا اس قدر بے حس نہیں ہے کہ اچھے اخلاق کی مٹاس اور بُرے اخلاق کی تلخی کو چمک لینے کے بعد آخر کار اس کا فیصلہ یہ ہو کہ مٹاس سے تلخی زیادہ بہتر ہے۔

اصلاح کے لئے نیک انسانوں کی تنظیم کے ساتھ دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہمارے سامنے بناؤ اور بگاڑ کا ایک واضح تصور موجود ہو۔ ہم اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ بگاڑ کیا ہے تاکہ اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے، اور بناؤ کیا ہے تاکہ اسے عمل میں لانے پر سارا زور لگا دیا جائے۔ تفصیلات میں جانے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ میں بڑے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے ان دونوں چیزوں کی ایک تصویر پیش کروں گا۔

انسانی زندگی میں بگاڑ جن چیزوں سے پیدا ہوتا ہے ان کو ہم چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔

(۱) خدائے بے خوفی، جو دنیا میں بے انصافی، بے رحمی، خیانت، اور ساری اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے۔

(۲) خدا کی ہدایت سے بے نیازی، جس نے انسان کے لئے کسی معاملہ میں بھی ایسے مستقل اخلاقی اصول باقی نہیں رہنے دئے ہیں جن کی پابندی کی جائے۔ اسی چیز کی بدولت اشخاص اور گروہوں اور قوموں کا سارا طرز عمل مفاد پرستی، لذت پرستی، اور خواہشات کی غلامی پر قائم ہو گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ نہ اپنے مقاصد میں جائز و ناجائز کی تمیز کرتے ہیں اور نہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کے بُرے سے بُرے ذرائع اختیار کرنے میں انہیں ڈراما تامل ہوتا ہے۔

(۳) خود غرضی، جو صرف اقلوی کو ایک دوسرے کی حق تلفی پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ بُرے پیمانے پر نسل پرستی، قوم پرستی، اور طبقاتی امتیازات کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس سے فساد کی بیشمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) یہودی یا بنی راہوی، جس کی وجہ سے انسان یا تو خدا کی دی ہوئی قوتوں کو استعمال ہی نہیں کرتا، یا غلط استعمال کرتا ہے، یا تو خدا کے بچتے ہوئے ذرائع سے کام نہیں لیتا یا غلط کام لیتا ہے۔ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ کاہل اور نکلے لوگوں کو زیادہ دیر تک اپنی زمین پر قابض نہیں رہنے دیتا بلکہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتا ہے جو کچھ نہ کچھ بنانے والے ہوں۔ دوسری صورت میں جب غلط کار قوتوں کی تخریب ان کی تعمیر سے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہٹا کر پھینک دی جاتی ہیں اور بسا اوقات خود اپنی ہی تخریبی کارروائیوں کا لقمہ بنا دی جاتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں وہ چیزیں بھی، جن کی بدولت انسانی زندگی بنتی اور سنورتی ہے، چار ہی عنوانوں کے تحت تقسیم ہوتی ہیں۔

(۱) خلافت، جو آدمی کو برائیوں سے روکنے اور سیدھا چلانے کے لئے ایک ہی قابل اعتماد ضمانت ہے۔ راستبازی، انصاف، امانت، حق شناسی، ضبط نفس، امدہ تمام دوسری خوبیاں جن پر ایک پُر امن اور ترقی پذیر تمدن و تہذیب کی پیدائش کا انحصار ہے، اسی ایک تخم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ بعض دوسرے عقیدوں کے ذریعہ سے بھی کسی نہ کسی حد تک انہیں پیدا کیا جاسکتا ہے، جس طرح مغربی قوموں نے کچھ نہ کچھ اپنے اندر پیدا کیا ہے، لیکن ان ذرائع سے پیدا کی ہوئی خوبیوں کا نشوونما بس ایک حد پر جا کر رک جاتا ہے، اور اس حد میں بھی ان کی بنیاد متزلزل رہتی ہے۔ صرف خدا ترسی ہی وہ پائدار بنیاد ہے جس پر انسان کے اندر برائی سے رکنے اور بھلائی پر چلنے کی صفت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتی ہے، اور عود و چاکرے نہیں بلکہ نہایت وسیع پہانے پر تمام انسانی معاملات میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

(۲) خدائی ہدایت کی پیروی، جو انسان کے شخصی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی رویہ کو اخلاق کے مستقل اصول کا پابند کرنے کی ایک ہی صورت ہے جب تک انسان اپنے اخلاقی اصولوں کا خود واضح اور صفت رہتا ہے، اس کے پاس باتیں بنانے کے لئے کچھ اور اصول ہوتے ہیں اور عمل میں لانے کے لئے کچھ اور کتابوں میں آیتیں ہیں وہ ایک قسم کے اصول لکھتا ہے اور معاملات میں اپنے مطلب کے مطابق بالکل دوسری ہی قسم کے اصول برتتا ہے۔ دوسرے مطالبہ کرتے وقت اس کے اصول کچھ ہوتے ہیں اور خود معاملہ کرتے وقت کچھ بقیہ اور مصلحت اور خواہش اور

ضرورت کے دباؤ سے اس کے اصول ہر آن بدلتے ہیں۔ وہ اخلاق کا اصل محور ”حق“ کو نہیں بلکہ ”اپنے مفاد“ کو بناتا ہے۔ وہ اس بات کو مانتا ہی نہیں کہ اس کے عمل کو حق کے مطابق ڈھلنا چاہیے، اس کے بجائے وہ چاہتا ہے کہ حق اس کے مفاد کے مطابق ڈھلے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت افراد سے لیکر قوموں تک سب کا رویہ غلط ہو جاتا ہے اور اسی سے دنیا میں فساد پھیلتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز انسان کو امن، خوش حالی اور فلاح و سعادت بخش سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کے کچھ ایسے اصول ہوں جو کسی کے مفاد کے لحاظ سے نہیں بلکہ حق کے لحاظ سے بنے ہوئے ہوں اور انہیں اٹل مان کر تمام معاملات میں ان کی پابندی کی جائے۔ خواہ وہ معاملات شخصی ہوں یا قومی، خواہ وہ تجارت سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست اور صلح و جنگ سے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اصول صرف خدائی ہدایت ہی میں نہیں مل سکتے ہیں، اور ان پر عمل درآمد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ انسان ان کے اندر رد و بدل کے اختیار سے دست بردار ہو کر انہیں قطعی واجب الاتباع تسلیم کرے۔

(۳) نظام انسانیت، جو شخصی، قومی، نسلی اور طبقاتی خود غرضیوں کے بجائے تمام انسانوں کے مساوی مرتبے اور مساوی حقوق پر مبنی ہو جس میں بجا امتیازات نہ ہوں جس میں اور نیچ نیچ، چھوٹ چھوٹ، اور مصنوعی تہذیب نہ ہوں جس میں بعض کے لئے مخصوص حقوق اور بعض کے لئے بناوٹی پابندیاں اور رکاوٹیں نہ ہوں جس میں سب کو یکساں پھلنے پھولنے کا موقع ملے جس میں انسان کی پستی و بلندی صرف اس کے اوصاف کی بنا پر جو ہیں اس میں اتنی وسعت ہو کہ روئے زمین کے سائے انسان اس میں برابری کے ساتھ شریک ہو سکتے ہوں۔

(۴) عمل صالح یعنی خدا کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے ذرائع کو پوری طرح استعمال کرنا اور صحیح استعمال کرنا۔

حضرات! یہ چار چیزیں ہیں جن کے مجموعہ کا نام ”نباؤ“ اور ”صلح“ ہے، اور ہم سب کی بہتری اس میں ہے کہ ہمارے اندر نیک انسانوں کی ایک ایسی تنظیم موجود ہو جو بگاڑ کے اسباب کو روکنے اور نباؤ کی ان صورتوں کو عمل میں لانے کے لئے پیہم جدوجہد کرے۔ یہ جدوجہد اگر اس ملک کے باشندوں کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئی تو خدا ایسا بے انصاف نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنی زمین کا انتظام اس کے اصلی باشندوں سے چھین کر کسی اور کو دیدے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ یہ ناکام ہوئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا، آپ کا، اور اس ارض سہیل کے رہنے والوں کا کیا انجام ہو گا!